(غلام گردش)

ایک قیدی کی فریاد!

کسی اور موضوع پر لکھنا چاہتا تھا۔مگر آج یہ خط موصول ہوا ہے۔ پڑھنے کے بعد ذہن میں صرف ایک خیال پیہم آ رہا ہے کہ آزاد لوگ، مقید انسانوں کی لاچارگی کے متعلق تصور بھی نہیں کر سکتے۔اس سے پہلے کہ قلم کی دھار کسی اور طرف مُڑ جائے، یہ خط خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

محترم عالی وقار چیف جسٹس صاحب!

میرا نام عمر ہے اور میں لاہور کی ایک جیل میں مقید ہوں۔اب تو لگتا ہے کہ کبھی آزاد تھا ہی نہیں۔کبھی اپنی مرضی سے کچھ کیا ہی نہیں۔گزشتہ دو برس سے جیل میں ہوں۔اس کال کوٹھری میں کیسے پہنچا، کیونکر، اس طرف آ گیا۔لگتا ہے کہ اپنے ہی سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ایچیسن کالج کا تعلیم یافتہ ہوں۔اسکے بعد لاہور کے ایف سی کالج میں پڑھتا رہا۔بینک میں ملازمت کے دوران کچھ ایسے گرداب میں آیا کہ سب کچھ برباد ہو گیا۔ناسمجھی، جوانی ایک خطرناک گھوڑے کی طرح ہوتی ہے۔اگر درست موقع پر اسکو زیرِ دست نہ کیا جائے تو انسان کے بھٹکنے کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔بہرحال اپنے کیس کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتا۔کیونکہ بتایا گیا ہے کہ جو معاملہ عدالت میں ہو، اس پر بات نہیں کرنی چاہیے۔مگر میں تو کسی موضوع پر بھی بات نہیں کرنا چاہتا۔زندگی نے شائد قوتِ گویائی چھین کر اپنی مٹھی میں ضبط کر لی ہے۔

ہاں، یہاں اخبار آتا ہے۔معلوم ہوتا رہتا ہے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔بس اخبار ہی باہر سے معمولی سا رابطہ ہے۔یا دو چار ہفتوں بعد عدالت میں پیشی کیلئے جاتا ہوں۔ویسے اب اخبار پڑھنا بھی چھوڑ چکا ہوں۔دل نہیں چاہتا۔زندگی پہلے ہی اتنی تلخ ہے کہ اس میں مزید تلخی لانا نہیں چاہتا۔پر بہرحال، کچھ نہ کچھ تو پتہ چلتا رہتا ہے۔محترم چیف جسٹس صاحب، میرے خط لکھنے کی وجہ ذاتی باتیں بتانا ہرگز نہیں ہے۔میں صرف اور صرف کرونا کے حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔پہلے تو اخبار سے معلوم ہوا کہ چین میں یہ وباء پھوٹ چکی ہے۔اندازہ نہیں تھا کہ یہ ہمارے ملک میں بھی آ جائیگی۔یہاں بھی لوگ اس کرونا سے سفرِ عدم کی طرف روانہ ہونا شروع ہو جائینگے۔مگر اب لگتا ہے کہ یہ کسی نہ کسی طریقے سے ہمارے ملک میں بلکہ میرے شہر لاہور میں بھی پھیل چکی ہے۔پتہ نہیں، کہ اپنا شہر لکھنا چاہیے یا نہیں۔کیونکہ جیل کی سلاخوں نے مجھے مقام سے بے نیاز کر دیا ہے۔اب تو لگتا ہے، یہیں پیدا ہوا ہوں۔ہمیشہ سے یہیں پر ہوں۔شائد آپکو میری ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔ویسے اپنے والد صاحب کو بتاتا ہوں کہ میرا ذہن تو ختم ہو چکا ہے۔اپنی عمر بتانا بھول گیا۔اس وقت تیس برس کا ہوں۔جیل ویسے بھی اَز حد مشکل جگہ ہے۔مگر کرونا نے اسے مزید مشکل بنا ڈالا ہے۔زندگی پہلے غم زدہ تھی مگر کرونا نے اسے اور غمگین کر دیا ہے۔اس جیل میں ہم تین ہزار قیدی ہیں۔ہر ملک کے حصے حصے سے، ہر شہر اور ہر نسل سے۔اخبارات میں پڑھا ہے کہ یہ وباء سماجی میل جول سے بڑھتی ہے۔اگر میں آزاد ہوتا تو گھر پر وقت گزارتا۔کس سے ملنا ہے اور کس سے نہیں ملنا، یہ میرے بس میں ہوتا۔مگر جیل میں تو کچھ بھی میرے بس میں نہیں ہے۔کچھ بھی۔جس بیرک میں رہتا ہوں اس میں درجنوں قیدی اور بھی ہیں۔ہم

سارے ایک دوسرے کے قریب قریب سونے پر مجبور ہیں۔کوٹھری میں اتنی وسعت ہی نہیں کہ دور دور رہا جائے۔جیل میں کتنے آدمی آسکتے تھے،اسکی گنجائش کتنی ہے اسکے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ویسے بھی اب تو کچھ بھی یاد نہیں۔کچھ بھی معلوم نہیں۔مگر دو سال سے یہاں رہنے کے بعد بخوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ یہ تین ہزار لوگوں کے لیے تعمیر نہیں کی گئی۔

جیل میں ممکنہ حد تک انسانی سہولتیں موجود ہیں۔بہرحال جو ہے،اس پر شکر ہے اور جو نہیں ہے اسکے متعلق سوچنا چھوڑ چکا ہوں۔عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں ایک ہسپتال بھی ہے مگر اس میں تیس چالیس مریض ہی آسکتے ہیں۔مطلب یہ کہ اگر جیل میں کرونا وباء پھیل جاتی ہے تو یہ چند ہفتوں میں اَن گنت قیدیوں کی زندگی ختم کر دیگی۔اگر آزاد ہوتا تو کچھ بندوبست کر سکتا تھا۔مگر یہاں تو کچھ بھی میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔شائد میرے مقدر میں کرونا سے مرنا تحریر ہوا تھا۔کیونکہ اگر یہاں میں بیمار پڑ گیا تو کچھ نہیں کر سکتا۔ویسے اب تو میرے بس میں عرصے سے کچھ نہیں ہے۔اپنی دو چھوٹی چھوٹی بیٹیوں کو ملے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔اپنے بیٹے کی شکل تک یاد نہیں ہے۔پر اب دکھ نہیں ہوتا۔اسلیے کہ دکھ تو ان لوگوں کو ہوتا ہے جو سوچ سکتے ہیں۔میرا ذہن تو عرصے سے ماؤف ہو چکا ہے۔جناب چیف جسٹس خدارا یہ نہ سمجھیے کہ میں اپنی ضمانت کروانا چاہتا ہوں۔ہرگز نہیں۔میرا مقدمہ چل رہا ہے۔کچھ عرصے میں شائد اسکا فیصلہ ہو جائے۔صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی جج جیل آکر عدالت لگا لے۔وہ تمام قیدی جو ریاست کیلئے خطرہ نہیں ہیں، جنکے جرائم اتنے سنگین نہیں ہیں کہ معاشرے کو ان سے خطرہ ہو ان تمام کو بھاری ضمانت کے عوض، رہائی دیدی جائے۔صرف اسلیے کہ وہ اس بات سے نہ مارے جائیں کہ وہ قید میں ہیں۔بے بس ہیں اور کرونا سے لڑنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔اردگرد سینکڑوں ایسے قیدی ہیں جو معمولی جرائم کی بدولت پابندِ سلاسل ہیں۔انکے مقدمات چل رہے ہیں۔بلکہ چلتے جا رہے ہیں۔اس طرح کے تمام مقید انسانوں کو صرف اور صرف انسانی ہمدردی کے تحت رِہا کر دیا جائے۔انکو ضمانت دیدی جائے۔انہیں موقعہ دیا جائے کہ وہ زندہ رہنے کی کوشش کر سکیں۔کرونا سے بچ سکیں۔لکھنے کو تو بہت کچھ ہے۔مگر کچھ بھی لکھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔مجھے نہیں معلوم کہ میرا لکھا ہوا خط اخبار میں چھپ سکے گا یا نہیں۔مگر یہ میرا خط ایک فریاد ہے۔ایک پکار ہے۔اور زندہ رہنے کی ایک کوشش ہے۔شائد کامیاب ہو جائے۔آخر میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا۔اسلیے کہ میرے پاس کسی کو کچھ بھی کہنے کی استطاعت نہیں رہی! لاہور کی جیل کا فقط ایک قیدی!

جب سے یہ خط مجھے موصول ہوا،اس وقت سے اس نوجوان کے متعلق سوچ رہا ہوں۔انکے ایک عزیز یہ مراسلہ لیکر میرے پاس آئے تھے۔پڑھنے کے بعد ذہن میں متضاد قسم کے جھکڑ چل رہے ہیں۔یہ نوجوان قیدی اور اسطرح کے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ آج اس ملک کی جیلوں میں قید ہیں۔انکا قصور ہے کہ نہیں، یہ فیصلہ تو صرف عدالتیں کر سکتی ہیں۔مگر کرونا جیسی وباء کا مقابلہ، بہرحال یہ سلاخوں کے پیچھے رہ کر ہرگز ہرگز نہیں کر سکتے۔چند دن پہلے جم خانہ لاہور میں کھانے پر گیا۔ہم کوئی چار لوگ تھے۔سب ایک دوسرے کے نزدیک بیٹھنے سے گریز کر رہے تھے۔ویٹر سے سینی ٹائزر (Sanitizer) منگوا کر ہاتھ پر بار بار مل رہے تھے۔ایک صاحب،ایک گھنٹے میں بار بار اپنے ہاتھ بھی دھو رہے تھے۔مقصد یہ کہ اپنے تئیں ابتدائی احتیاط کر رہے تھے۔اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔اگر ایک موذی بیماری سے چند معمولی احتیاطیں کر کے بچا جا سکتا ہے تو ضرور کرنی چاہییں۔درست ہے موت کا ایک دن مقرر ہے۔مگر وباء سے بچنا بھی لازم ہے۔کیونکہ

غیر ضروری طریقے سے موت کو گلے لگانا بھی دانشمندی نہیں۔ کھانے سے واپس آ کر انٹرنیٹ پر ایک سائٹ سے استفادہ کیا۔ اب میں بھی دن میں صابن سے ہاتھ دھوتا ہوں۔ ہاں، Sanitizer استعمال نہیں کرتا۔ اسلیے کہ پڑھ رکھا ہے کہ صابن بھی اتنا ہی مفید ہوتا ہے۔ جتنا یہ کیمیکل زدہ ہاتھ دھونے والا پانی۔ لیکن اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں کہ قید میں موجود لوگوں کو اس وباء سے کیسے بچایا جائے۔ جس وقت تمام لوگ اس آفت کا مقابلہ کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں، ان مجوس لوگوں کو اس جان لیوا بیماری سے کیونکر محفوظ رکھا جائے۔ یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر ہم سب کو سوچنا چاہیے اور مناسب فیصلے کرنے چاہییں۔ پر نہیں، سب کچھ اہتمام سے پہلے ایک بات لکھنا بھول گیا کہ کیا ہمارے ارباب اختیار، ان قیدیوں کو انسان سمجھتے ہوئے کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں یا نہیں۔ اسلیے کہ سنا ہے، انصاف کے دل میں پتھر کا دل ہوتا ہے۔ مگر صائب بات یہ ہے کہ قیدی بھی ہماری طرح کے انسان ہیں۔ انکے دکھ، سکھ، آزاد اور تکالیف اتنی ہی محترم ہیں جتنی کسی بھی ایسے آدمی کی جو اس مرض سے کوئی بھی قدم اُٹھا سکتا ہے۔ قیدیوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ ہمیں انکے متعلق سوچنا چاہیے۔ ہر ممکن قدم اُٹھانا چاہیے۔ انکی صحت اور زندگی کا خیال کرنا چاہیے۔

قانون کا معمولی سا طالبعلم ہوں۔ ویسے اس ملک میں قانون کی عملداری ہے۔ اس پر بہرحال دو متضاد ذہنی رویے موجود ہیں۔ میری نظر میں ہم جتنے مرضی ٹوٹے پھوٹے بلکہ ادنیٰ نظام میں زندگی گزار رہے ہوں، ہمیں اس ناقص نظام میں رہتے ہوئے لوگوں کی بھلائی کیلئے سوچنا چاہیے۔ اس وقت عام آدمی سے ہٹ کر بات کر رہا ہوں۔ ملک میں درجنوں جیلوں میں موجود لوگوں کے مصائب کی بات کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے کچھ احباب، ان تمام رائندہ درگاہ افراد کے متعلق بات کرنا پسند نہ کریں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چند ارباب اقتدار یہ سوچیں کہ قیدی تو معمولی پتنگوں کی طرح ہیں۔ انکی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔ لہذا ان بے وقعت لوگوں پر کیوں توجہ دی جائے۔ مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ قیدی ہماری توجہ کے مستحق ہیں اور انکی صحت اور فلاح و بہبود کی فکر، ریاست کے تمام اداروں کی دائم ذمہ داری ہے۔ اس سے کوئی بھی ادارہ مفر حاصل نہیں کر سکتا۔ نہ انتظامیہ اور نہ ہی عدلیہ۔ نہ پارلیمنٹ اور نہ ہی کوئی اور ریاستی ادارہ۔

غیر معمولی حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ غیر معمولی اقدامات کیے جائیں۔ اس وقت جب کرونا ہم پر حملہ کر چکا ہے۔ تو ہمیں ہر طرح کے تعصب سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف اس وباء سے لڑنا چاہیے۔ طالبعلم کی دانست میں ملک کی تمام جیلوں میں عدالتیں لگنی چاہیے۔ وہ تمام قیدی، جو کسی طرح بھی ریاست کیلیے خطرہ نہیں ہیں، انہیں ضمانت یا پیرول پر آزاد کرنا چاہیے۔ اسکے علاوہ بھی اگر کوئی طریقہ ہو تو اسے استعمال کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر کرونا جیلوں میں پہنچ گیا تو یہ ایسی تباہی مچا سکتا ہے، جسکا تصور بھی کرنا دشوار ہے۔ عمر نام کے قیدی کا خط، شائد اس کالم کے توسط سے محترم چیف جسٹس تک پہنچ جائے۔ شائد ہم اَن گنت انسانوں کو اپنی مرضی سے سانس لینے کی اجازت دے دیں۔ پتہ نہیں کیوں دل کہتا ہے کہ سپریم کورٹ یا ہائیکورٹ کے چیف جسٹس عمر کی اس فریاد پر ضرور توجہ دینگے۔ اسلیے بھی کہ مجبور، لاوارث اور مظلوم کی آواز تو خدا بھی براہِ راست سنتا ہے!

راؤ منظر حیات